پیاسے رہو لیکن پانی کو چھونا مت!

خان حسنین عاقبؔ

علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، مومن پورہ، واشم روڈ، پوسد (مہاراشٹر)

جماعت میں بچے شور مچا رہے تھے، لیکن استاد کے داخل ہوتے ہی سارا شور شرابہ تھم سا گیا۔ استاد ذرا خوش مزاج تھے اس لیے بچے ان سے تھوڑی بہت مستی بھی کر لیا کرتے تھے، لیکن ان کی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ اگر استاد کسی بات پر ناراض ہو جاتے تو بچے پریشان ہو جاتے۔ استاد کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ دیکھ کر بچے مطمئن ہو گئے۔ استاد نے پوچھا 'بچو! آج کون سی تاریخ ہے؟' بہت سے بچے عادتاً ایک ساتھ بولے 'سر! آج چودہ اپریل ہے'۔ استاد نے دوبارہ مسکرا کر پوچھا 'جانتے ہو آج کے دن کی خاص بات کیا ہے؟' بچے دماغ لڑانے لگے۔ اچانک عدنان بول اُٹھا 'سر! آج امبیڈکر جینتی ہے'۔ استاد نے خوش ہو کر عدنان کے نزدیک آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے 'شاباش، تم نے بالکل درست پہچانا عدنان، چلو، اسی موقع پر ہم تمہیں ایک بچے کی اور اس کے بچپن کی کہانی سناتے ہیں'۔ سب بچے خوش ہو کر بول پڑے 'سر! کون سی اور کس کی کہانی سنانے والے ہیں آپ؟' استاد بولے 'یہ تم کو پہچاننا ہے۔ ہو سکتا ہے تم کہانی کے درمیان میں ہی پہچان لو کہ ہم کس کی کہانی سنا رہے ہیں۔ خیر چلو، کہانی سنو'۔ سب بچے ہاتھ باندھ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ استاد بولنے لگے 'اکثر بچے سوچتے ہیں کہ بڑے لوگ بڑے ہی پیدا ہوتے ہوں گے۔ یعنی اتنے ہی مشہور، معروف، دولت مند، بڑی حیثیت والے اور طاقتور، لیکن ایسا نہیں ہے! ہو سکتا ہے کہ کچھ چنندہ لوگ ایسے ہوں جو اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، لیکن اکثر لوگ جب پیدا ہوتے ہیں تو غربت انہیں اپنی آغوش میں پال پوس کر بڑا کرتی ہے۔ یہ لوگ ہم جیسے یعنی آپ جیسے اور مجھ جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی محنت، لگن، دوڑ دھوپ، مشقت، اونچا حوصلہ، ہمت اور جرأت انہیں بڑا بناتی ہے۔ کیوں، میں نے صحیح کہا نا بچو؟' بچے جوش سے بولے 'ہاں سر! بالکل درست، ہم نے کچھ لوگوں کی کہانیوں میں پڑھا بھی ہے'۔ استاد نے کہا 'تو چلو، ہم کہانی شروع کرتے ہیں۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے۔ رام جی مالوجی سکپال نامی ایک شخص انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ فوج کی نوکری میں ملک بھر میں ادھر سے اُدھر تبادلے ہوتے رہنا ایک عام بات ہے۔ اس مرتبہ ان کا تبادلہ مہو کی فوجی چھاؤنی میں ہوا۔ مہو اندور کے نزدیک فوجی چھاؤنی ہے جو موجودہ مدھیہ پردیش ریاست میں واقع ہے۔ فوج کی نوکری میں یہی مشکل ہوتی ہے کہ جہاں کا حکم ہو، جانا ہی ہوتا ہے۔ اسی دوران رام جی اور ان کی بیوی بھیما بائی سکپال کے گھر، مہو میں، ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی۔ رام جی نے اپنے بیٹے کا نام بھیم راؤ رکھا'۔

امِ عمارہ جوش میں بول پڑی، 'سر! بھیم راؤ تو شاید

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کا اصلی نام تھا نا؟'

استاد کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ انھیں اپنی جماعت کے طلبا پر فخر ہوا کہ وہ پوری توجہ سے بات سُن رہے ہیں اور اچھی خاصی معلومات بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے امِ عمارہ کو آزمانے کے لیے ایک سوال کیا۔ 'اچھا امِ عمارہ، ذرا بتاؤ تو کہ باباصاحب امبیڈکر کا اہم کارنامہ کیا ہے؟'

امِ عمارہ نے فوراً جواب دیا، 'سر! انھوں نے آزادی کے بعد ہمارے ملک کا دستور یعنی آئین تیار کیا تھا۔'

استاد نے اس مرتبہ نہ صرف اسے شاباشی دی بلکہ اپنی جیب سے قلم نکال کر ساری جماعت کے سامنے اسے انعام میں دیا۔ سارے بچے تالی بجانے لگے۔ استاد نے کہا، 'بچو! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم لوگ تالی بجانے کی جگہ سبحان اللہ یا الحمدللہ کہہ کر کسی کی حوصلہ افزائی کریں؟ ہمیں ایک طرف ثواب حاصل ہوگا تو دوسری طرف ہم تالی بجانے جیسے غیر مہذب فعل سے بھی بچیں گے۔'

تمام بچوں نے سبحان اللہ اور الحمدللہ کہہ کر امِ عمارہ کی حوصلہ افزائی کی۔ استاد نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا، 'چلو، اب آگے کی کہانی سنو۔

بھیم راؤ کی ماں بھیما بائی اپنے شوہر کی خدمت گزار اور نہایت صبر و برداشت والی تھیں۔ انہیں کُل چودہ اولادیں تھیں جن میں بھیم راؤ سب سے چھوٹے تھے۔ رام جی فوج میں ترقی کرتے کرتے صوبیدار میجر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ اسی عہدے سے وہ سبکدوش یعنی ریٹائر ہوئے۔ جب نوکری ختم ہوگئی تو رام جی سارے خاندان کو لے کر اپنے وطن، موجودہ مہاراشٹر کے ضلع رتناگری کے گاؤں داپولی تحصیل کے گاؤں 'امباوڑے' چلے گئے۔ چونکہ وہ امباوڑے کے رہنے والے تھے اس لیے انہیں امباوڑے کر کہا جاتا تھا۔ اچھا، اب ایک مزے کی بات سُنو۔ ان کا نام 'امباوڑیکر' بڑا اٹ پٹا اور ادائیگی میں مشکل تھا۔ اسکول میں بڑی مشکل سے ان کا نام لیا جاتا۔ اسکولی تعلیم کے دوران ہی ان کی زندگی میں ایک استاد آئے جن کا نام تھا 'کرشنا جی کیشو امبیڈکر'۔ انھوں نے ایک دن بھیم راؤ کو بلایا اور کہا، 'بھیم راؤ، آج سے میں تمہیں مشکل نام کی مصیبت سے نکالتا ہوں اور تمھیں اپنا نام دیتا ہوں۔ اب تم 'امباوڑیکر' نہیں بلکہ 'امبیڈکر' ہو۔ بس، اسی دن سے وہ زندگی بھر کے لیے امبیڈکر بن گئے۔ اب نہ کوئی انہیں سکپال کے نام سے یاد کرتا ہے اور نہ ہی امباوڑیکر کے نام سے۔ لوگوں کو اگر یاد ہے تو بس، امبیڈکر۔ خیر، چلو، کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

امباوڑے کے مراٹھی اسکول میں بھیم راؤ کے بڑے بھائی آنند زیرِ تعلیم تھے اس لیے ننھے بھیم راؤ کو بھی اسی اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ گھر میں لوگ زیادہ تھے اور رام جی کی پنشن چھٹا نک بھر۔ اب اتنی سی پنشن میں گھر کیا چلتا؟ وہ فکرمند ہوگئے۔ حالات زیادہ خراب نہ ہوں اس لیے رام جی نے ستارا ضلع میں نئی ملازمت حاصل کی اور اپنے خاندان سمیت وہیں منتقل ہوگئے۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ بھیما بائی کا انتقال ہوگیا۔ ننھے بھیم راؤ ماں کے سائے سے محروم ہوگئے۔ اب ان کی زندگی نئی ڈگر پر چلنے لگی۔ ایسے میں ماں کی کمی ان کی پھوپی میرا بائی نے پوری کی۔ میرا بائی بہت حوصلہ مند خاتون تھیں۔ گھر میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ انھوں نے ایک ماں کی طرح بھیم راؤ سے محبت کی۔

چلو بچو، اب یہاں سے ہم کہانی کو تھوڑا موڑ دیتے ہیں۔ بھیم راؤ کا بچپن تمہارے اور ہمارے جیسا نہیں تھا۔

انھیں اپنے بچپن ہی سے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے مسائل ہمارے مسائل کی طرح نہیں تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف چھوت چھات کا دور دورہ تھا۔ملک کے کونے کونے میں اونچی ذات اور نچلی ذات کا بھید بھاؤ عام تھا۔نچلی ذات کے لوگوں کو پاس بیٹھنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ہوٹلوں میں ان کی نشستیں، برتن اور پانی پینے کے گلاس الگ ہوتے تھے۔الگ گلاس نہ ہونے کی صورت میں انہیں اپنے ہاتھوں کو پیالہ بنا کر پانی پینا پڑتا تھا۔ٹرینوں، بسوں اور دیگر سواریوں میں ان کے لیے الگ جگہیں ہوتی تھیں۔کیا تم لوگ جانتے ہو کہ بھیم راؤ سکپال بھی نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے؟ بچے کچھ نہ بولے۔وہ تو نہایت دلچسپی سے یہ سب باتیں سُن رہے تھے۔استاد بولے،..جی ہاں، وہ 'مہار' ذات کے تھے۔نچلی ذات سے تعلق ہونے کی وجہ سے بھیم راؤ کو جو ذلت اور توہین برداشت کرنی پڑتی تھی، اب اس کا بیان سنو۔یہ بھی سوچو کہ ایک بچہ جسے اپنے فطری ماحول میں پڑھنے لکھنے، کھیلنے کودنے کا موقع ملنا چاہئے تھا، اسے کیا ملتا تھا؟ اونچی ذات کے بچوں سے توہین آمیز سلوک، اسکول میں اساتذہ سے ذلت آمیز رویہ، کھیل کود اور سیکھنے کے معاملات میں بھید بھاؤ۔جماعت میں اونچی ذات کے طلبا ان سے کہتے، 'اے لڑکے، پیچھے جا کر بیٹھ۔ہمارے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھنے کی ہمت مت کرنا۔' کھیل کے میدان میں کوئی ان کے ساتھ کھیلنا پسند نہ کرتا۔انہیں ستارا میں بھی ستایا گیا اور ممبئی جانے کے بعد بھی۔

انھیں ستایا.....اساتذہ نے
انھیں ستایا.....غیر تدریسی ملازمین نے
انہیں ستایا.....ساتھی طلبا نے

کیسے؟

ان کی تذلیل و توہین کی گئی۔انھیں الگ تھلگ کر دیا جاتا تھا۔ان سے کوئی رابطہ اور میل ملاپ رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔یہاں تک کہ جس دن اسکول کا چپراسی غیر حاضر ہوتا، اس دن انہیں پیاسا رہنا پڑتا۔کیوں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پانی نہیں لے سکتے تھے۔اس لیے کہ وہ اچھوت سمجھے جاتے تھے۔اس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ 'پیاسے رہو، لیکن پانی کو چھونا مت'! بھیم راؤ کے ننھے ذہن پر ان سب باتوں کا بہت گہرا اثر ہوا۔

اگر بھیم راؤ ایک عام بچہ ہوتے تو سب کچھ سہہ جاتے اور بھول بھال کر اپنے کاموں میں لگ جاتے، لیکن نہیں۔ آگے چل کر بھیم راؤ سکپال کو بابا صاحب امبیڈکر بننا تھا۔ملک کا دستور تیار کرنا تھا۔وہ ایک عام بچہ نہیں تھے۔ انھوں نے یہ سب باتیں اپنی آپ بیتی 'ویٹنگ فار ویزا' (یعنی اجازت نامے کے انتظار میں) میں درج کی ہیں۔اب آپ خود سوچئے کہ جس کا بچپن ایسا ہو، وہ کیا کھیلتا ہوگا؟ کون اسے اپنے ساتھ رہنے دیتا ہوگا؟ وہ کیسے خوش رہتا ہوگا؟ وہ کیسے ہنستا کھیلتا ہوگا؟ اگر آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا ایسی نا انصافیاں برداشت کر پاتے؟ بالکل نہیں! پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں بھید بھاؤ اور چھوت چھات جیسی کوئی برائی نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ اسلام میں ظلم برداشت کرنے کو بھی ظلم کا ساتھ دینا کہا گیا ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں امبیڈکر جیسا بچپن نہیں گزارنا پڑا۔آپ بھی کوشش کیجئے کہ جو کامیابیاں انھوں نے محرومی سے بھرا بچپن گزار کر حاصل کیں، آپ اپنے بچپن کو بھرپور انداز میں گزار کر حاصل کریں۔

OO